بھی اسی سوار کی سی تھی۔ اسی سوار کی طرح وہ آہستہ آہستہ زندگی کے مرحلے طے کرتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ گھوڑے پر جھنجلاتی ہوگی۔ دوسرے سواروں کو آگے بڑھتا دیکھ کر اسے خواہش ہوتی ہوگی کہ اس کا گھوڑا بھی اتنا ہی تیز خرام ہوتا، لیکن وہ رنجیدہ نہ تھی۔ اپنے نصیبوں کو نہ روتی تھی۔ وہ گائے کی طرح تھی جو ایک پیلی سی پگھیا کے بندھن میں پڑ کر اپنی ناند کے بھوسے کھلی میں مگن رہتی ہے۔ سامنے ہرے بھرے میدان ہیں، اس میں اشتہا انگیز گھاسیں لہرا رہی ہیں، مگر رسی توڑ کر کبھی ادھر نہیں جاتی۔ اس کی اس رسی اور لوہے کی زنجیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

عالم شباب میں محبت کی اتنی پیاس نہیں ہوتی جتنی خودنمائی کی یہ پیاس بعد کو آتی ہے۔ رتن کو خودنمائی کے سبھی سامان ملے ہوئے تھے۔ اس کا شباب میں مست دل اپنی زیبائش اور آرائش میں خوش تھا۔ ہنسی مذاق، سیر و تفریح، کھانا پینا یہی اس کی زندگی تھی۔ اس سے گہرے پانی میں اسے جانے کی نہ خواہش تھی، نہ غرض۔ فارغ البالی بہت کچھ رنج و محن کا ازالہ کرتی رہتی ہے۔ اس کے پاس اتنی مصیبتوں کو بھلانے کے لیے کتنے ہی سامان ہیں۔ سینما ہے۔ سیر و سیاحت ہے۔ کتابوں کا معاملہ ہے۔ سرود و ستار ہے۔ پالتو جانور ہیں، لیکن افلاس کو بھلانے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ روئے، اپنی تقدیر کو کوسے اور دنیا سے مایوس ہو کر خودکشی کر لے۔ رتن کی تقدیر نے پلٹا کھایا تھا۔

اور یہ ہوا اپنے ہی ہاتھوں۔ پنڈت جی ان آدمیوں میں تھے، جنہیں موت کی فکر نہیں ہوتی۔ انہیں کسی طرح یہ خیال ہو گیا تھا کہ دائم المریض آدمی اگر احتیاط اور پرہیز سے رہے تو اس کی عمر دراز ہو سکتی ہے۔ وہ پرہیز اور احتیاط کے دائرے سے

باہر کبھی نہیں جاتے تھے۔ پھر موت کو ان سے کیا دشمنی تھی۔ جو خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑتی۔ اپنی وصیت لکھنے کا خیال انہیں اس وقت آیا جب قریب المرگ ہوئے، لیکن رتن وصیت کا نام سنتے ہی اتنی پریشان اور غمگین ہوئی کہ پنڈت جی نے اسے اس وقت ملتوی کرنا ہی مناسب سمجھا۔ تب سے انہیں اتنا ہوش نہ آیا کہ وصیت لکھواتے۔

پنڈت جی کی وفات کے بعد رتن دنیا سے اس قدر بیزار ہوگئی کہ اسے کسی بات کی بھی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب اسے خاص طور پر ہوشیار رہنا چاہیے تھا۔ گویا دشمنوں نے اسے گھیر رکھا ہو، مگر اس نے سب کچھ منی بھوشن پر چھوڑ دیا اور اس منی بھوشن نے رفتہ رفتہ اس کا سارا اثاثہ ہضم کرلیا۔ ایسا سوانگ بھرا کہ سادہ لوح رتن کو اس کی فتنہ انگیزیوں کی بھنک تک نہ ملی۔ پھندا جب خوب کس گیا تو اس نے ایک دن آ کر رتن سے کہا:

''آج بنگلہ خالی کرنا ہوگا۔ میں نے اسے بیچ دیا ہے۔''

رتن نے تیز ہو کر کہا: ''میں نے تو تم سے کہا ابھی بنگلہ نہ بیچوں گی۔''

منی بھوشن نے ظاہر داری کا پردہ اتار پھینکا اور بولا: ''آپ میں یہ بہت بڑا عیب ہے کہ آپ ایک بات کہہ کر اسے بھول جاتی ہیں۔ اسی کمرے میں میں نے آپ سے یہ ذکر کیا تھا اور آپ نے حامی بھری تھی۔ جب میں نے بنگلہ بیچ دیا تو آپ یہ رنگ لائیں۔ یہ بنگلہ آج خالی کرنا ہوگا اور آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''میں ابھی یہیں رہنا چاہتی ہوں۔''

''میں آپ کو یہاں نہ رہنے دوں گا۔''

''میں تمہاری لونڈی نہیں ہوں۔''

''آپ کی خبر گیری کا بار مجھ پر ہے۔ اپنے خاندان کے حفظ و وقار کے لیے میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

رتن نے ہونٹ چبا کر کہا: ''میں اپنی عصمت کی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔ تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔ میری اجازت کے بغیر تم کوئی چیز فروخت نہیں کر سکتے۔''

منی بھوشن نے گولی سی ماری: ''آپ کا اس گھر پر اور چچا صاحب کی جائیداد پر کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میری ملکیت ہے۔ آپ مجھ پر صرف گزارے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔''

رتن نے حیرت میں آ کر کہا: ''تم کچھ بھگ تو نہیں کھا گئے ہو؟''

منی بھوشن نے بے دردانہ انداز میں کہا: ''میں اتنی بھنگ نہیں کھاتا ہے سر پیر کی باتیں کرنے لگوں۔ آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ ایک بڑے وکیل کی بیوی تھیں۔ قانون کی بہت سی باتیں جانتی ہوں گی۔ مشترکہ خاندان کی بیوہ کا شوہر کی جائیداد پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ چچا صاحب اور میرے والد میں کبھی علیحدگی نہیں ہوئی، اگر چچا صاحب اپنی جائیداد آپ کو دینا چاہتے تو کوئی وصیت ضرور لکھ جاتے اور اگر چہ قانوناً اس وصیت کی کوئی وقعت نہ ہوتی، مگر ہم اس کا احترام کرتے۔ مرحوم کا کوئی وصیت نہ لکھنا ثابت کر رہا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی خاص سلوک نہ کرنا چاہتے تھے۔ آج آپ کو بنگلہ خالی کرنا ہوگا۔ دوسرے سامان بھی نیلام کر دیئے جائیں گے۔ آپ کی مرضی ہو میرے ساتھ چلیں یا یہیں رہیں۔ یہاں رہنے کے لیے

آپ کو دس پندرہ روپے کا مکان کافی ہوگا۔ گزارا کے لیے پچاس روپے مہینہ کا انتظام میں نے کر دیا ہے۔ کل مطالبات ادا کرنے کے بعد اس سے زیادہ گنجائش ہی نہیں ہے۔"

رتن نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر وہ مفلوج سی بیٹھی رہی۔ پھر موٹر منگوائی اور سارا دن وکیلوں کے پاس دوڑتی رہی۔ کتنے ہی وکیلوں سے پنڈت جی کا یارانہ تھا۔ ہر ایک نے ان کی حالت سن کر رنج کیا اور وکیل صاحب کے وصیت نہ لکھ جانے پر تعجب کرتے رہے۔ اب اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ ثابت کرے کہ وکیل صاحب اور ان کے بھائی میں علیحدگی ہوگئی تھی اور یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ تو رتن کا اس جائیداد پر قبضہ ہو جائے گا، ورنہ اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔

رتن شام کو گھر لوٹ آئی۔ اس نے فیصلہ یا جو کچھ میرا نہیں ہے، اسے لینے کے لیے میں جھوٹ کا سہارا نہ لوں گی۔

اتنے دنوں میں وہ اپنے آپ کو اس گھر کی مالکن سمجھتی رہی۔ یہ کتنی بڑی غلطی تھی۔ شوہر کی زندگی میں جو لوگ اس کا منہ تاکتے تھے، وہ آج اس کے مخدوم بنے ہوئے ہیں۔ یہ ذلت رتن جیسی خوددار عورت کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ مانا کمائی پنڈت جی کی تھی، لیکن یہ گاؤں تو اسی نے خریدا تھا۔ کئی مکان تو اس کے اپنے ہی ہاتھوں سے بنوائے تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ کیا تھا کہ ایک دن یہ جائیداد اس کی زندگی کی کفیل ہوگی۔ اسے اس جائیداد کے خریدنے میں اس کی ترقی اور تنظیم میں وہی مسرت ہوتی تھی، جو ماں اپنی اولاد کو پھلتے پھولتے

دیکھ کر حاصل کرتی ہے۔ اس میں غرض کا شائبہ بھی نہ تھا۔ محض اپنے پن کا غرور تھا۔ وہی محبت تھی، لیکن شوہر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے پالے اور گود کے کھلائے ہوئے بچے بھی اس کی گود سے چھین لیے گئے۔ اس کا ان پر اب کوئی اختیار نہیں۔ اگر وہ جانتی کہ ایک دن یہ مسئلہ ضرور پیش ہوگا تو وہ چاہے روپے کو لٹا دیتی، خیرات کرتی، مگر ملکیت کی تیخ اپنے سینے میں نہ لگاتی۔ کیا گرمیوں میں وہ منصوری یا نینی تال نہ جا سکتی تھی۔ ایک کیا دو چار نوکر اور نہ رکھے جا سکتے تھے۔ اگر وہ زیور ہی بنواتی تو ایک ایک مکان کی قیمت کا ایک ایک زیور بنوا سکتی تھی، مگر اس نے نفس کو کبھی پاؤں نہ پھیلانے دیا۔ کیا اس نفس کشی کا یہی صلہ تھا۔ جو چیز کل تک اس کی تھی، آج اس کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کل تک وہ دوسروں کی پرورش کرتی تھی، آج وہ خود دوسروں کی محتاج ہے۔

دفعتاً اس کے دماغ میں ایک تغیر ہوا۔ وہ کیوں اپنے آپ کو بے کس سمجھے۔ کیوں غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ دنیا میں لاکھوں ہی عورتیں دیدہ ریزی کر کے اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ کیا وہ کپڑے نہیں سی سکتی تھی۔ کسی چیز کی چھوٹی موٹی دکان نہیں رکھ سکتی۔ لڑکوں کو بھی پڑھا سکتی ہے۔ یہی تو ہوگا۔ لوگ ہنسیں گے، مگر اسے ہنسی کی کیا پروا۔ یہ اس کی ہنسی نہیں ہے۔ اپنی قوم کی رسم و رواج کی ہنسی ہے۔

شام کو دروازے پر کئی ٹھیلے والے آ گئے۔ منی بھوشن نے آ کر کہا: ''میں نے ایک مکان طے کر لیا ہے۔ آپ جو چیزیں کہیں لدوا کر بھیج دوں۔''

رتن نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا: ''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، نہ تم میرے

لیے کوئی مکان لو۔ جس پر میرا کوئی اختیار نہیں، وہ میں ہاتھ سے بھی نہیں چھوتی۔ میں اپنے گھر سے لے کر کچھ نہیں آئی تھی، اسی طرح لوٹ جاؤں گی۔''

منی بھوشن نے شرمندہ ہو کر کہا: ''آپ کا سب کچھ ہے۔ یہ آپ کیسے کہتی ہیں کہ آپ کا کچھ اختیار نہیں۔ آپ وہ مکان دیکھ لیں۔ میں تو سمجھتا ہوں، آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی؟''

رتن نے طنزیہ انداز سے کہا: ''اتنا بڑا مکان لے کر میں کیا کروں گی۔ میرے لیے ایک کوٹھڑی ہی کافی ہے، جو دو روپیہ میں مل جائے گی۔ سونے کے لیے زمین ہی ہے۔ احسان کا بوجھ سر پر جتنا ہی کم ہو، اتنا ہی اچھا۔''

منی بھوشن نے عاجزی سے کہا: ''آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟ کچھ تو کہیے؟''

رتن نے جواب دیا: ''میں کچھ نہیں چاہتی۔ میں اس گھر کا ایک تنکا بھی اپنے ساتھ نہ لے جاؤں گی۔ جس چیز پر میرا کوئی اختیار نہیں، وہ میرے لیے ویسی ہی ہے جیسے کسی غیر کی چیز۔ تم ان چیزوں کے مالک ہوتے جاؤ میں ذرا بھی برا نہیں مانتی۔ رحم کی چیز نہ زبردستی لی جا سکتی ہے، نہ زبردستی دی جا سکتی ہے۔ دنیا میں ہزاروں بیوہ عورتیں پڑی ہوئی ہیں۔ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔ میں بھی انہیں کی طرح مزدوری کروں گی اور نہ کر سکوں گی تو کسی گڈھے میں ڈوب مروں گی۔ جو اپنا پیٹ بھی نہ پال سکے، اسے زندہ رہ کر دوسروں کے اوپر بار بننے کا حق نہیں ہے۔''

یہ کہتی ہوئی رتن گھر سے نکلی اور دروازہ کی طرف چلی۔ منی بھوشن نے اس کا راستہ روک کر کہا۔ ''اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو میں ابھی بنگلہ نہ بیچوں؟''

رتن نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنسوؤں کے امنڈے ہوئے سیلاب کو روک کر بولی:

''میں نے کہہ دیا اس گھر کی کسی چیز پر میرا دعویٰ نہیں ہے۔ میں کرائے کی لونڈی تھی۔ لونڈی کا گھر سے کیا تعلق۔ نہ جانے کس پاپی نے یہ قانون بنایا تھا۔ اگر ایشور کہیں ہے اور اس کے یہاں انصاف ہوتا ہے تو ایک دن اسی کے سامنے اس پاپی سے پوچھوں گی۔ کیا تیرے گھر میں ماں بہن نہ تھیں۔ تجھے اس کی توہین کرتے شرم نہ آئی؟ اگر میری زبان میں اتنی طاقت ہوتی کہ اس کی آواز سارے ملک میں پہنچ سکتی، تو میں اپنی بہنوں سے کہتی۔ بہنو! کسی مشترکہ خاندان میں شادی مت کرنا اور اگر کرنا تو جب تک اپنا گھر الگ نہ بنالینا، آرام کی نیند مت سونا۔ خاندان تمہارے لیے پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہے۔ تمہیں پار لے جانے والی کشتی نہیں، تمہیں نگل جانے والا اجانور ہے۔''

شام ہوگئی تھی۔ گرد سے بھری ہوئی پھاگن کی ہوا چلنے والوں کی آنکھوں میں دھواں جھونک رہی تھی۔ رتن چادر سنبھالتی ہوئی سڑک پر چلی جارہی تھی۔ راستہ میں کئی پہچان کی عورتوں نے اسے ٹوکا، کئی نے اپنی موٹر روک لی اور اسے بیٹھنے کو کہا، مگر رتن کو ان کی ہمدردی تیرگی لگ رہی تھی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی جالپا کے گھر جارہی تھی۔ آج اس کی اصلی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

ٹھیک دس بجے جالپا اور دیبی دین کچہری پہنچ گئے۔ تماشائیوں کی کافی بھیڑ تھی۔ اوپر کی گیلری تو بھری ہوئی تھی۔ ہزاروں آدمی سامنے کے میدان میں کھڑے تھے۔ جالپا اوپر گیلری میں جا بیٹھی۔ دیبی دین برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔

اجلاس پر جج کے ایک طرف اہلمد تھا۔ دوسری طرف پولیس کے کئی عملے کھڑے تھے۔ سامنے کٹہرے کے باہر دونوں طرف کے وکیل کھڑے مقدمہ پیش ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ملزموں کی تعداد پندرہ سے کم نہ تھی۔ سب کٹہرے کی بغل میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سبھی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ کوئی لیٹا تھا۔ کوئی بیٹھا تھا۔ دو پنجے لڑا رہے تھے۔ دو میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ سبھی بشاش تھے..... مایوسی یا غم کا کسی کے چہرے پر نشان نہ تھا۔

گیارہ بجتے بجتے مقدمہ کی پیشی ہوئی۔ پہلے پولیس کی شہادتیں ہوئیں۔ آخر میں کوئی تین بجے رمانا تھ کچہری میں لایا گیا۔ تماشائیوں میں سنسنی پھیل گئی۔ کوئی تنبولی کی دکان سے پان کھاتا ہوا بھاگا۔ کسی نے اخبار کو مروڑ کر جیب میں رکھا اور اجلاس کی طرف دوڑا۔ جالپا بھی سنبھل کر بارجے میں کھڑی تھی۔ وہ چاہتی تھی ایک بار رما کی آنکھیں اٹھ جاتیں اور وہ اسے دیکھ لیتی، لیکن رما سر جھکائے کھڑا تھا۔ گویا آنکھیں اٹھاتے ڈر رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا۔ کچھ سہما ہوا گھبرایا ہوا اس طرح کھڑا تھا، گویا اسے کسی نے باندھ رکھا ہے اور بھاگنے کی راہ نہیں ہے۔ جالپا کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ جیسے اس کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

رما کا بیان شروع ہوا۔ پہلا ہی جملہ سن کر جالپا کانپ اٹھی۔ دوسرے جملے نے اس کی تیوریوں پر بل ڈال دیئے۔ تیسرے جملے نے اس کے چہرے کا رنگ فق کر دیا اور چوتھا جملہ سننا تھا کہ وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر پیچھے رکھی ہوئی کرسی پر گر پڑی، مگر پھر دل نہ مانا۔ جنگلے پر جھک کر ادھر کان ہی لگا دیئے۔ وہی پولیس کی سکھائی ہوئی شہادت تھی۔ جس کا خلاصہ وہ دیبی دین کے منہ سے سن چکی تھی۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ جالپا نے کئی بار کھانسا کہ شاید رما کی آنکھیں اب بھی اوپر اٹھ جائیں، لیکن رما کا سر اور بھی جھک گیا۔ معلوم نہیں اس نے جالپا کے کھانسنے کی آواز پہچان لی یا ندامت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ اس کی آواز کچھ اور دھیمی ہو گئی۔

ایک خاتون نے جو جالپا کے پاس ہی بیٹھی تھی، ناک سکوڑ کر کہا: ''جی چاہتا ہے کہ اس شیطان کے گولی مار دے۔ ایسے ایسے خود غرض لوگ بھی اس بدنصیب دیش میں پڑے ہیں، جو تھوڑے فائدے کے لیے بے گناہوں کا گلا دباتے بھی نہیں ہچکچاتے۔''

جالپا نے کوئی جواب نہ دیا۔

ایک دوسری خاتون نے، جو آنکھوں پر عینک لگائے ہوئے تھیں، تلملا کر کہا: ''اس بدنصیب ملک کا ایشوری مالک ہے۔ گورنری تو لالہ کو کہیں مل نہیں جاتی۔ زیادہ سے زیادہ کلرکی مل جائے گی۔ اس کے لیے اپنا ایمان بیچے ڈالتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی نہایت کمینہ آدمی ہے۔''

تیسری عورت نے عینک والی دیوی سے مسکرا کر پوچھا: ''آدمی تو فیشن ایبل اور پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا تم اسے پا جاؤ تو کیا کرو؟''

عینک والی نے جوش سے کہا: ''ناک کاٹ لوں، بس نکٹا بنا کر چھوڑ دوں۔''

''جانتی ہو، میں کیا کروں؟''

''نہیں، شاید گولی مار دو گی؟''

''نہیں گولی نہ ماروں۔ سر بازار کھڑا کر کے پانچ سو جوتے لگواؤں۔ چاند گنجی ہو جائے۔''

''تمہیں ذرا بھی رحم نہ آئے گا؟''

''یہ کچھ رحم ہے۔ اس کی پوری سزا تو یہ ہے کہ کسی اونچی پہاڑی سے دھکیل دیا جائے۔''

ایک ضعیفہ نے ان دیویوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا: ''کیوں مفت میں منہ خراب کرتی ہو۔ یہ غریب نفرت کے قابل نہیں، رحم کے قابل ہے۔ دیکھتی نہیں ہو اس کا چہرہ کیسا زرد ہو گیا ہے؟ جیسے کوئی اس کا گلا دبائے ہوئے ہے۔ اپنی ماں یا بہن کو دیکھ لے تو ضرور رو پڑے گا۔ آدمی کا دل برا نہیں ہے۔ پولیس نے مار پیٹ کر سیدھا کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ایک لفظ اس کے دل کو چیرتا ہوا نکل رہا ہے۔''

عینک والی خاتون نے طعنہ مارا: ''جب اپنے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے، تبھی آہ نکلتی ہے۔''

جالپا اب وہاں نہ ٹھہر سکی۔ ایک ایک لفظ چنگاری کی طرح اس کے دل پر لگتا تھا۔ دل میں ایسا ابال آتا تھا کہ اسی وقت اٹھ کر کہہ دوں کہ یہ شخص بالکل جھوٹ بول رہا ہے۔ اور اسی وقت اس کا ثبوت دے دے۔ اس غصۂ جائز کو پوری

طاقت سے دبائے ہوئے تھی۔ اس کا ضمیر اس کے تحمل پر ہی نفرین کر رہا ہے۔ کیوں وہ اسی وقت ساری کیفیت بیان نہیں کر دیتی۔ پولیس اس کی دشمن ہو جائے گی، ہو جائے۔ عدالت کو تو کچھ خیال ہو گا۔ ممکن ہے غریبوں کی جان بچ جائے۔ کم سے کم عوام کو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹی شہادت ہے۔ اس کے منہ سے ایک بار آواز نکلتے نکلتے رہ گئی۔

آخر وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلی آئی۔

دیبی دین اسے اترتے دیکھ کر برآمدے میں آیا اور ہمدردانہ لہجہ میں بولا: ''کیا گھر چلتی ہو بہو جی؟''

جالپا نے آنسوؤں کی یورش کو روک کر کہا: ''ہاں اب یہاں بیٹھا نہیں جاتا۔''

احاطہ سے باہر نکل کر دیبی دین نے جالپا کو تشفی دینے کے ارادے سے کہا: ''پولیس نے جسے ایک بار بوٹی سنگھا دی، اس پر کسی دوسری بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔''

جالپا نے کچھ دیر جواب نہ دیا۔ کچھ دور تک دونوں خاموش چلتے رہے۔ یکا یک جالپا نے کہا: ''کیوں دادا اب اور تو کہیں اپیل نہ ہو گی؟ قیدیوں کا یہیں فیصلہ ہو جائے گا؟''

دیبی دین اس سوال کا مطلب سمجھ گیا اور بولا: ''نہیں ہائی کورٹ میں اپیل ہو سکتی ہے۔''

پھر تھوڑی دیر تک دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ جالپا ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی اور بولی: ''دادا میرا جی چاہتا ہے آج جج صاحب سے مل کر سارا واقعہ

کہہ دوں۔ شروع سے جو کچھ ہوا، سب کچھ سناؤں۔ میں ثبوت دوں گی تب تو مانو گے۔''

دیبی دین نے آنکھیں پھاڑ کر کہا: ''جج صاحب سے؟''

جالپا نے کہا: ''ہاں۔''

دیبی دین آنکھیں پھاڑ کر بولا: ''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہو جی! حاکم کا واسطہ نہ جانے چت پڑے یا پٹ۔''

جالپا بولی: ''وہ کیا پولیس والوں سے کہہ نہیں سکتا کہ تمہارا گواہ فرضی ہے۔''

''کہہ تو سکتا ہے۔''

''تو آج میں اسی سے ملوں۔ مل تو لیتا ہے۔''

''چلو دریافت کریں گے، لیکن جوکھم کی بات ہے۔''

''کی جوکھم ہے بتاؤ؟''

''بھیا پر کہیں جھوٹی گواہی کا الجام لگا کر سجا کر دے تو؟''

''تو کچھ نہیں، جو جیسا کرے ویسا بھرے۔''

دیبی دین نے جالپا کی اس بے دردی پر متحیر ہو کر کہا: ''ایک دوسرا کھٹکا بھی ہے۔ سب سے بڑا ڈر اسی کا ہے۔''

جالپا نے پوچھا: ''وہ کیا؟''

دیبی دین: ''پولیس والے بے مروت ہوتے ہیں۔ کسی کی عزت اتار لینا تو ان کے لیے دل لگی ہے۔ جج صاحب پولیس کمشنر کو بلا کر یہ سب حال جرور کہیں گے۔ کمشنر سوچے گا یہی عورت سارا کھیل بگاڑ رہی ہے۔ اسی کو گرفتار کر لو۔ جج

انگریج ہوتا تو نڈر ہو کر پولیس کو تنبیہ کرتا۔ ہمارے بھائی تو ایسے مکدموں (مقدموں) پر منہ کھولتے ڈرتے ہیں کہ کہیں سرکار ان سے برا نہ مان جائے۔ جج صاحب پولیس کمشنر سے جرور کہیں گے۔ پھر یہ تو ہوگا کہ مکدمہ اٹھالیا جائے۔ یہی ہوگا کہ کبھی نہ کھلنے پائے۔ کبھی کبھی کب گواہ بدلنے لگتا ہے تو پولیس والے اس کے ساتھ بری بدعت کرتے ہیں۔''

جالپا کو اپنی گرفتاری کا خوف نہ تھا، لیکن یہ خوف ضرور تھا کہ رما پر کہیں آفت نہ آ جائے۔ اس خوف نے اس کی ہمت پست کر دی۔ اس وقت ایک تکان معلوم ہوئی۔ گویا سینکڑوں میل کی منزل پار کر آئی ہو۔

کچھ دور اور چلنے کے بعد اس نے دیبی دین سے پوچھا: ''اب تو ان سے ملاقات نہ ہو سکے گی؟''

دیبی دین نے سر ہلا کر کہا: ''کسی طرح نہیں۔ پہرہ اور کڑا کر دیا جائے گا۔ چاہے وہ بنگلہ ہی چھوڑ دیا جائے اور اب ان سے ملاقات ہو ہی گئی تو کیا اب کسی طرح اپنا بیان بدل نہیں سکتے۔ دروگ (دروغ) حلفی میں پھنس جائیں گے۔''

کچھ دور اور چل کر جالپا نے کہا: ''میں سوچتی ہوں گھر چلی جاؤں۔ یہاں رہ کر اب کیا کروں گی؟''

دیبی دین نے پر درد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا: ''نہیں، نہیں بہو ابھی میں نہ جانے دوں گا۔ تم چلی جاؤ گی تو یہاں پل بھر بھی ہمارا جی نہ لگے گا۔ بڑھیا تو رو رو کر جان دے دے گی۔ ابھی یہاں رہو۔ دیکھو کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ بھیا کو میں اتنے کچے دل کا آدمی نہ سمجھتا تھا۔ نہ جانے لوگ کیسے سرکاری نوکری پر جان دیتے

ہیں۔ مجھے تو کوئی سو روپے بھی طلب دے تو نوکری نہ کروں۔ اپنے روزگار کی بات ہی دوسری ہے۔ اس میں آدمی کبھی تھکتا ہی نہیں۔ نوکری میں تو جہاں پانچ چھ گھنٹے ہوئے کہ بدن ٹوٹنے لگا۔ جھپکیاں آنے لگیں۔"

راستے میں اور کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ جالپا کا دل اپنی شکست ماننے کے لیے کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ وہ ناکام ہو کر ایک ناظر کی بے تعلقی سے اس تماشے کو دیکھنے پر قناعت نہ کر سکتی تھی۔ وہ اس تماشے میں شریک ہو کر اپنا پارٹ ادا کرنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ کیا ایک بار پھر رما سے ملاقات ہو گی۔ اس کے دل میں ان آتشیں الفاظ کا ایک شعلہ سا دہک رہا تھا، جو وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔ اسے رما پر ذرا بھی رحم نہ آتا تھا۔ اس سے شمہ بھر بھی ہمدردی نہ ہوتی تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔ تمہاری دولت اور تمہارا عہدہ تمہیں مبارک ہو۔ جالپا کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ جس نے ان حقیر چیزوں کے لیے اپنا ضمیر بیچ دیا، اسے میں انسان نہیں سمجھتی۔ تم انسان نہیں ہو تم حیوان بھی نہیں ہو۔ نامرد ہو، روسیاہ ہو۔

جالپا کا چہرہ فرط غضب سے چمک اٹھا۔ غرور سے اس کی گردن تن گئی۔ وہ شاید سمجھتے ہوں گے، جالپا جس وقت مجھے چھبے دار پگڑی باندھے گھوڑے پر سوار دیکھے گی، پھولی نہ سمائے گی۔ جالپا اتنی کور باطن نہیں ہے۔ تم گھوڑے پر نہیں آسمان پر اڑو، میری نظروں میں قاتل ہو۔ میں نے چلتے چلتے سمجھایا تھا۔ اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ جالپا تمہاری محتاج نہیں ہے۔

ایک مہینہ گزر گیا۔

جالپا کئی دن تک بہت بے قرار رہی۔ کئی بار جنون سا ہوا کہ سارا واقعہ کسی اخبار میں چھپوا دے، لیکن دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی کوئی طاقت اس کی زبان بند کر دیتی تھی۔ رما کی طرف سے وہ بے تعلق ہو گئی تھی۔

اس کے اوپر اب اسے غصہ نہ آتا تھا، رحم بھی نہ آتا تھا۔ صرف ایک بے نیازی تھی۔ اس کے مر جانے کی خبر پا کر شاید اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے۔ ہاں اسے تقدیر کا ایک کھیل سمجھ کر تھوڑی دیر کے لیے رنجیدہ ہو جاتی۔ شادی کا وہ رشتہ باقی تھا۔ اس درمیان میں اس نے رما کو کئی بار اپنے مکان کے سامنے سے جاتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کسی کی تلاش کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان آنکھوں میں کچھ شرم تھی۔ کچھ عذر تقصیر تھا، لیکن جالپا نے کبھی اس کی طرف آنکھ نا اٹھائی۔

وہ شاید اس وقت آ کر اس کے پیروں پر گر پڑتا تب بھی وہ اس سے مخاطب نہ ہوتی۔ رما کی اس نفرت انگیز خود غرضی نے جالپا کے دل کو مجروح کر دیا تھا۔ پھر بھی اس رشتۂ الفت کا نشان ابھی قائم تھا۔

رما کی محبت آمیز بے خودی، جسے دیکھ کر ایک دن وہ خوشی سے متوالی ہو جاتی تھی، کبھی کبھی اس کے باطن میں چھپی ہوئی تاریکی میں ایک غمناک ٹمٹماتی ہوئی شمع مزار کی طرح چمک اٹھتی، لیکن پھر اسی تاریکی اور غم کا پردہ پڑ جاتا۔

وہی جالپا، جو پہلے بات بات پر ضد کیا کرتی تھی، اب خدمت، ایثار اور حلیم کی

صورت بنی ہوئی تھی۔ جگو منع کرتی رہتی، پر وہ اندھیرے ہی میں سارے گھر میں جھاڑو لگا آتی۔ چوکا برتن کر ڈالتی۔ آٹا گوندھ کر رکھ دیتی۔ بڑھیا کو صرف روٹی بنانا باقی رہ جاتی۔ بڑھیا اس کو ٹھیل ٹھال کر رسوئی میں لے جاتی اور کچھ نہ کچھ کھلا دیتی۔ دونوں میں ماں بیٹی کی سی محبت ہو گئی تھی۔

مقدمہ کی کاروائیاں ختم ہو چلی تھیں۔ دونوں طرف کے وکیلوں کی بحث ختم ہو چکی تھی۔ صرف فیصلہ سنانا باقی تھا۔ آج اسی فیصلے کی تاریخ تھی۔ آج علی الصبح گھر کے کام دھندے سے فرصت پا کر جالپا روزانہ اخبار والے کی آواز پر کان لگائے بیٹھی تھی۔ گویا آج اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

اتنے میں دیبی دین نے اخبار لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ جالپا اخبار پر ٹوٹ پڑی اور آج کا فیصلہ پڑھنے لگی۔ فیصلہ کیا تھا ایک خیالی افسانہ تھا، جس کا ہیرو رما تھا۔

جج نے بار بار اس کی تعریف کی تھی۔ سارا مقدمہ اسی کے بیانات پر مبنی تھا۔

دیبی دین نے پوچھا: ''فیصلہ چھپا ہے؟''

جالپا نے اخبار پڑھتے ہوئے کہا: ''ہاں تو۔''

''کس کی سزا ہوئی؟''

''کوئی نہیں چھوٹا۔ ایک کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ پانچ کو دس دس سال کی اور آٹھ کو پانچ پانچ سال کی۔ پھانسی اسی وینش کو ہو گی۔''

یہ کہہ کر اس نے اخبار پھینک دیا اور ایک لمبی سانس لے کر بولی: ''ان بیچاروں کے بال بچوں کا نہ جانے کیا حال ہو گا؟''

دیبی دین نے سرگرمی سے کہا: ''تم نے کس دن مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا، اسی دن سے میں ان سبھوں کا پتا لگا رہا ہوں، اوروں کا تو ابھی تک بیاہ ہی نہیں ہوا ہے، صرف ونیش کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بڑھیا ماں ہے اور بیوی ہے۔ یہاں کسی سکول میں ماسٹر تھا۔''

جالپا نے پوچھا: ''اس کے گھر کا کچھ پتا لگا سکتے ہو؟''

دیبی نے کہا: ''ہاں کیا مشکل ہے۔''

جالپا: ''تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ابھی تو وقت ہے، چلو دیکھ کر آئیں۔''

دیبی: ''پہلے میں دیکھ تو آؤں۔ اس طرح اٹھ کر میرے ساتھ کہاں کہاں دوڑتی پھرو گی؟''

جالپا نے مجبورانہ انداز سے سر جھکا لیا اور کچھ نہ بولی۔

دیبی دین چلا گیا۔ جالپا پھر اخبار دیکھنے لگی، مگر اس کا دھیان ونیش کی طرف لگا ہوا تھا۔ غریب پھانسی پا جائے گا۔ جس وقت اس نے پھانسی کا حکم سنا ہوگا، اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس کی بوڑھی ماں اور بیوی یہ خبر سن کر چھاتی پیٹنے لگی ہوں گی۔ بیچارہ سکول ماسٹر ہی تو تھا۔ مشکل سے روٹیاں چلتی ہوں گی۔ اس کی مصیبتوں کے تخیل سے اسے رما کے ساتھ ایسی نفرت پیدا ہوئی کہ ضبط نہ کر سکی۔ دل میں ابال سا اٹھ رہا تھا کہ رما اس وقت آ جائے تو اس کی ملامت کرے کہ وہ بھی یاد کرے۔ تم انسان نہیں ہو۔ تم انسان کی صورت میں خونخوار درندے ہو۔ تم اتنے خبیث النفس ہو کہ آج کمینہ سے کمینہ آدمی بھی تمہارے اوپر تھوک رہا ہے۔ تمہیں کسی نے پہلے

ہی کیوں نہ قتل کر دیا۔ ان لوگوں کی جان تو جاتی ہی، مگر تمہارے منہ میں کالک تو نہ لگتی۔

شام ہو گئی لیکن دیبی دین نہ آیا۔ رفتہ رفتہ آٹھ بج گئے۔ دفعتاً ایک موٹر دروازہ پر آ کر رکی۔

رما نے اتر کر جگو سے پوچھا: ''کیوں دادی سب خیر و عافیت تو ہے؟ دادا؟''

جگو نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر کر بولی: ''کہیں گئے ہوں گے۔ میں نہیں جانتی۔''

رما نے سونے کی چار چوڑیاں جیب سے نکال کر جگو کے پیروں پر رکھ دیں اور بولا: ''یہ تمہارے لیے لایا ہوں دادا پہنو۔ ڈھیلی تو نہیں ہیں۔''

جگو نے چوڑیاں اٹھا کر زمین پر پٹک دیں اور آنکھیں نکال کر بولی: ''بھگوان کی دیا سے بہت چوڑیاں پہن چکی ہوں اور اب بھی سیر دو سیر سونا پڑا ہوگا، لیکن جو کھایا اپنی محنت کی کمائی سے۔ کسی کا گلا نہیں دبایا۔ پاپ کی گٹھڑی سر پر نہیں لادی۔ اس کوکھ میں آگ لگے، جس نے تم جیسے کپوت کو جنم دیا۔ یہ پاپ کی کمائی لے کر تم بہو کو دینے آئے ہو۔ سمجھتے ہو گے تمہارے روپوں کی تھیلی دیکھ کر وہ لٹو ہو جائے گی۔ اتنے دنوں اس کے ساتھ رہ کر بھی تمہاری لوبھی آنکھ اسے نہ پہچان سکی۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو انہی پیروں جہاں سے آئے ہو، وہیں لوٹ جاؤ۔ اس کے سامنے جا کر کیوں اپنا پانی اتروا ؤ گے؟ تم آج پولیس کے ہاتھوں زخمی ہو کر آئے ہوتے تو بہو تمہاری پوجا کرتی۔ تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔ وہ ان عورتوں میں ہے، جو چاہے مصیبتیں سہیں، لیکن کسی کی برائی نہیں دیکھ سکتیں۔ اگر تم میرے

لڑکے ہوتے تو تمہیں زہر دے دیتی۔ کیوں کھڑے مجھے جلا رہے ہو، چلے کیوں نہیں جاتے۔ میں نے تم سے کچھ لے تو نہیں لیا ہے۔''

رما سر جھکائے خاموش سنتا رہا۔ تب دل گرفتہ ہو کر بولا: ''دادی میں نے برائی کی ہے اور اس کے لیے مرتے دم تک شرمندہ رہوں گا، لیکن تم مجھے جتنا کمینہ سمجھ رہی ہو، اتنا کمینہ نہیں ہوں۔ اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ پولیس نے میرے ساتھ کیسی کیسی زیادتیاں کیں، تو تم مجھ سے اتنی زیادہ ناراض نہ ہوتیں۔''

جالپا کے کانوں میں ان کی آوازوں کی بھنک پڑی۔ اس نے زینے سے جھانک کر دیکھا۔ رما ناتھ کھڑا ہے۔ سر پر بنارسی ریشمی صافہ تھا، ریشم کا بڑھیا کوٹ اور آنکھوں پر سنہری عینک۔ اس ایک ہی مہینہ میں اس کا جسم چوگنا ہو گیا تھا۔ رنگت بھی نکھر آئی تھی۔ ایسی رونق اس کے چہرے پر کبھی نظر نہ آئی تھی۔ رما کے آخر الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے۔ باز کی طرح ٹوٹ کر دھم دھم کرتی نیچے آئی اور بولی:

''اگر سختیوں سے اتنا دب سکتے ہو تو تم بے غیرت ہو۔ تمہیں اپنے آپ کو مرد کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیا سختیاں کی تھیں ذرا سنوں۔ لوگوں نے ہنستے ہنستے سر کٹائے ہیں۔ اپنے بیٹوں کو مرتے دیکھا ہے۔ کولہو میں پیلے جانا منظور کیا ہے، مگر حق سے جو بھر بھی منحرف نہیں ہوئے۔ تم کیوں دھمکی میں آ گئے۔ کیوں نہیں سینہ کھول کر کھڑے ہو گئے کہ اسے گولی کا نشانہ بنا لو، مگر میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ کیوں نہیں سر جھکا دیا۔ روح اس لیے جسم کے اندر رکھی گئی ہے کہ جسم اس کی حفاظت کرے، اس لیے نہیں کہ اس کو تباہ کر دے۔ آخر اس کا کیا انعام ملا۔ ذرا

معلوم تو ہو۔''

رما نے دبی ہوئی آواز سے کہا: ''ابھی تو وعدے ہی وعدے ہیں۔''

جالپا نے ناگن کی طرح پھنکار کر کہا: ''یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ایشور سے یہی دعا کر رہی تھی لیکن تم جیسے موم کے پتلوں کو پولیس کبھی ناراض نہیں کرے گی۔ جاؤ شوق سے زندگی کے مزے لوٹو۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا اور آج پھر کہتی ہوں کہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ تم مر گئے، تم بھی سمجھ لو کہ میں مر گئی۔ بس جاؤ۔ میں عورت ہوں اگر کوئی سختیاں کرا کر مجھ سے ایسی شرمناک حرکت کرانے کی کوشش کرے تو چاہے اسے نہ مار سکوں، مگر اپنی گردن پر چھری چلا لوں گی۔ کیا تم میں عورتوں کے برابر بھی ہمت نہیں ہے؟''

رما نے عاجزی سے گڑگڑا کر کہا: ''تم میرا کوئی عذر نہ سنو گی؟''

جالپا نے کہا: ''نہیں!''

''تو میں منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں؟''

''تمہاری خوشی۔''

رما ایک لمحہ تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ تب آہستہ آہستہ برآمدے کے نیچے جا کر جگو سے بولا: ''دادا آئیں تو کہہ دینا مجھ سے ذرا دیر کے لیے مل لیں۔ جہاں کہیں آ جاؤں گا۔''

جگو نے پگھل کر کہا: ''کل یہیں چلے آنا۔''

رما نے موٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا: ''یہاں اب نہ آؤں گا دادی۔''

موٹر چلی گئی تو جالپا نے حاسدانہ انداز سے کہا: ''موٹر دکھانے کو آئے تھے جیسے